ڈاکٹر ارشاد بیگم

استاد شعبہ اردو ،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلا م آباد

عصمت چغتائی کے کرداروں میں ان کی شخصی جھلک

Dr. Irshad Begum

Senior Instructor Urdu Department,

National University of Modern Language, Islamabad.

The Personality of Ismat Chughtai in her Characters

Ismat Chughtae is a well-known short story writer of Urdu. She herself have been accredited as the rebel of Urdu literary tradition. Her rebellion was not only an ideological but also she believed in rebellion as a lifestyle. Her characters are an evocation of her rebellious thought. Rebellion is a way to equalize social inequalities. In sub -continent al society women used to sacrifice their personal rights in order to follow religious, moral, social or legal obligations. Ismat created rebel characters of women to give a hope of change. Not only her female but also male characters are rebels of prevalent social norms and values. Although this rebellion seems superficial, but as fiction is a bit larger picture of life, it does not seem that much odd. Progressive writers association brought rebellion and rebellious characters in vogue. But Ismat Chughtae has presented larger than life character which will be remembered as hallmark in the history of literature.

عصمت چغتائی اردو کی ممتاز افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں۔ انھوں نے افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ناول نگاری کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی۔ وہ درس و تدریس کے پیشے سے منسلک رہیں۔ عصمت چغتائی نے اپنی تحریروں کا آغاز ماہنامہ "ساقی" سے کیا۔ ان کی تحریریں ترقی پسند منشور کے مطابق ہیں۔ اسی لیے انھوں نے ترقی پسند ادیبوں میں منفرد مقام حاصل کیا۔ عصمت چغتائی کی شخصیت میں روایات سے انحراف کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ انھوں نے معاشرتی

بے حسی کا مقابلہ نہ صرف ڈٹ کر کیا بلکہ اپنی تحریروں میں بھی معاشرتی سفاکی و بے حسی کو واضح انداز میں بیان کیا۔ ان کے کردار اپنے حق کے لیے ڈٹ کر مقابلہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تحریریں مشعلِ راہ کے طور پر انسانیت سوزی کے خلاف ایک نئی سمت کا تعین کرتی ہیں۔ چونکہ عصمت چغتائی کی اپنی شخصیت ریاکاری اور منافقت سے پاک تھی اسی لیے ہمیں ان کے کرداروں میں بھی دوغلا پن دکھائی نہیں دیتا۔ انھوں نے معاشرتی کمزوریوں کے ہر پہلو کا گہرا مشاہدہ کیا اور اس مشاہدے کو اپنی تحریروں میں قلمبند کیا۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کی نفسیاتی الجھنیں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل ان کی اکثر تحریروں کا موضوع رہے ہیں۔ عصمت چغتائی کی فکر معاشرے کی دوغلی سوچ سے مطابقت نہیں رکھتی تھی اسی لیے انھوں نے ایک ہندو لڑکے سے اپنی بیٹی کی شادی کو نہ صرف فراخدلی سے قبول کیا بلکہ انھوں نے خود بھی اس مٹی میں دفن ہونا بھی پسند نہ کیا۔

قرۃ العین حیدر کہتی ہیں۔

"عصمت آپا بنیادی طور پر اس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جسے ایک زمانے میں Free Thinker کہا جاتا تھا۔ ان کی بڑی بیٹی نے بنگلور میں سول میرج کر لی اور اطلاع دی کہ اس کے ساس سسر مذہبی رسوم کی ادئیگی بھی چاہتے ہیں آپ بھی آجایئے۔ بنگلور سے واپس آکے عصمت آپا نے اپنے خاص انداز میں نہایت محظوظ ہوتے ہوئے سنایا کہ

> "صبح صبح میں اٹھ گئی۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ ان کا پنڈت آگیا۔ اب وہ بیچارا ایک کمرے میں پریشان بیٹھا تھا۔ کہنے لگا مہورت نکلی جا رہی ہے اور یہاں کوئی نہیں ہے میں پوجا کیسے شروع کروں۔ میں نے کہا پنڈت جی، آپ کیوں فکر کرتے ہیں میں پوجا شروع کرائے دیتی ہوں۔ بس میں بیٹھ گئی اور میں نے پوجا شروع کرا دی"۔ (۱)

عصمت چغتائی کی قوتِ مشاہدہ خاصی تیز تھی اسی وجہ سے وہ عورت کی پسماندگی، بے بسی اور لاچاری پر کڑھتی تھیں۔ انھوں نے اپنی جنبشِ قلم سے معاشرے کی پسی ہوئی خواتین کے حق میں صدائے احتجاج بلند کی۔ انھیں یہ شعور تھا کہ ہمارے معاشرے میں عورت کی خستہ حالی کا سبب اس کی اقتصادی غلامی ہے اور اس لاچاری و بے بسی سے اسے تبھی نجات مل سکتی ہے جب وہ پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی قوت رکھتی ہو۔ اسی لیے ان کی سوچ کے دھارے جنس کی تفریق کے بغیر تمام کرداروں میں دیکھے جاسکتے ہیں عصت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کے آپس میں گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان دونوں ادیبوں نے معاشرے کی سفاکیوں کا پردہ چاک کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان دونوں ادیبوں پر سرکشی کا الزام لگایا گیا۔

الطاف فاطمہ قمطراز ہیں۔

> "ان دونوں ہی ادیبوں (منٹو اور عصمت چغتائی) کے بارے میں خوب خوب لکھا گیا۔ ان کو سماج اور معاشرے کا باغی ٹھہرایا گیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان پر الزام ایسا کچھ غلط بھینہ تھا۔ منٹو تو خیر رسوائے

زمانہ ٹھہرے ہی ٹھہرے ان کے چرچے بھی خوب ہوئے پر اب ان کی بھی اس ضمن میں ناموری ہی رہے گی اور وہ بھی اس میدان میں ان کی مرد قرار پائیں گی"۔ (۲)

عصمت چغتائی ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۱ کی ایک سوگوار صبح اپنے بستر پر مردہ حالت میں پائی گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں قبر سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اسی لیے مرنے سے بیشتر وہ اکثر کہتی تھیں کہ بڑی مجھے تو قبر سے ڈر لگتا ہے۔ میں بھسم ہونے کی وصیت کر چکی ہوں۔ بقول ان کے یہ میرا جسم ہے میرا دل و دماغ ہے۔ میں جو چاہوں گی وہی ہو گا۔ اس طرح عصمت موت کے بعد بھی ایک ہنگامے کو جنم دے گئیں اور ایک جذباتی بحث چھڑ گئی۔

ڈاکٹر ایم سلطان بخش لکھتی ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کا انتقال نیند کے دوران میں ہوا۔ عصمت چغتائی جب تک زندہ رہیں۔ بے شمار ہنگامے ان کی ذات سے وابستہ رہے۔ ان کی وفات بھی ایک دھماکہ ثابت ہوئی۔ "مجھے قبر سے خوف آتا ہے میں تو بھسم ہونے کی وصیت کر چکی ہوں"۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کے جسد خاکی کو بمبئی کے چندنواڑی شمشان گھاٹ میں، آگ کے شعلوں کی نذر کر کے، راکھ میں تبدیل کر دیا گیا"۔ (۳)

عصمت نے معاشرے کی مقرر کردہ حدود سے انحراف کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرتی جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنے کرداروں کو اپنے تجربات کی روشنی میں تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ ان کی تخلیقات میں سماجی تنقید خوبصورت انداز میں دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے نہایت ہی سفاکانہ انداز سے معاشرے کی بے حسی پر نشتر چلائے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں عورتوں کی مظلومیت کی عکاسی کی اور لوگوں کو احساس دلایا کہ عورتوں کے ساتھ انصاف ضروری ہے۔ کیونکہ اگر انصاف نہ مل سکے تو وہ اپنی آسودگی کے لیے دوسرے راستے اختیار کرتی ہیں۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی عصمت کے فن کے بارے لکھتے ہیں:

عصمت کی پیش کردہ عورت باغی ہونے کی کلغی اپنے ماتھے پر لگاتی تو ہے لیکن یہ اس پر جیسے بہتان ہوتا ہے وہ سمجھوتہ کر لیتی ہے اور یہی سمجھتی ہے کہ معاشی ناہمواری کو دور کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ گو کہ اس میں ذلت ہے رسوائی ہے اگر ایسا ہے تو یہ دنیا کیوں تماشا دیکھ رہی ہے، ہمیں بچانے کیوں نہیں آتی۔ وہ لوگوں کی امداد کا انتظار کرنے کی بجائے خود بھی بغاوت کر سکتی ہے۔۔۔ (۴)

عصمت چغتائی کی ادبی خدمات کو بھلایا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایسی تلخ حقیقت نگار ہیں جنھوں نے معاشرے کی برائیوں اور کمزوریوں پر نشتر چلاتے ہوئے انہیں منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی۔ اگر دیکھا جائے تو عام طور پر تو انھوں نے معاشرتی کمزوریوں کو ہر پہلو سے دیکھا لیکن بالخصوص نوجوان لڑکیوں کی فطرت کے ان کمزور پہلوؤں کی عکاسی کی جنھیں کوئی دوسرا ادیب چھونے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر ہارون ایوب کے مطابق:

عصمت چغتائی ترقی پسند مصنفین میں اس حیثیت سے انفرادیت کی حامل ہیں کہ انھوں نے مسلم متوسط گھرانوں کی پردہ نشین لڑکیوں کی نفسیاتی الجھنوں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ دراصل اس طرح وہ مسلم معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کو بے نقاب کرنا چاہتی ہیں۔ (۵)

عصمت چغتائی کی شخصی جھلک نہ صرف ان کے نسوانی کرداروں میں بلکہ ان کے مردانہ کرداروں میں بھی نمایاں ہے مثال کے طور پر ان کے پہلے ناول ''ضدی'' کے ہیرو پورن کے کردار کو دیکھا جاسکتا ہے یہ ایک امیر زمیندار راجہ صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ چھوٹا بیٹا ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ اسی بگاڑ کی وجہ سے وہ جو چاہتا ہے پالیتا ہے ضدی طبیعت کی وجہ سے اس نے اپنے جیون ساتھی کے انتخاب میں بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔ اپنے گھر میں کام کرنے والی بوڑھی ملازمہ کی نواسی آشا کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ آشا سے پیار نے اسے روایات و اقدار سے منحرف کر دیا۔ اسے نہ گھر والوں کی عزت و ناموس کا خیال تھا اور نہ ہی کسی قسم کی سماجی بندشیں اس کی راہ میں حائل تھیں۔ پورن نے سب سے پہلے اپنی محبت کے بارے میں اپنے بڑے بھائی سے بات کی اور بتایا کہ وہ آشا سے شادی کا متمنی ہے۔ سب گھر والے یہ خبر سنتے ہی سکتے میں آ گئے۔ انھوں نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کے اس امر پر لوگ کیا کہیں گے کیونکہ یہ ہم پلہ رشتہ نہیں ہے۔ انھوں نے پورن کو ممکنہ خطرات سے بھی آگاہ کیا اور ان سے بچنے کی ناکام کوشش کی۔ بھتیجی شیلہ کا واسطہ دیا کہ چچا کے اس عمل کے بعد شریف خاندان کا کوئی لڑکا بھی اس شادی کے لیے تیار نہ ہو گا۔ بڑے بھیا نے اپنے سسرالیوں کے ردِ عمل سے دھمکانے کی کوشش کی لیکن پورن کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ اس پر تو عشق کا بھوت سوار تھا جو نہی ماں نے سمجھانے کی کوشش کی تو اس کا ردِ عمل کچھ یوں تھا:

بس ماتا جی رہنے دیجیے۔۔۔ پتا جی۔۔۔ بھیا میرا جواب سن لیجیے میں آشا سے شادی کروں گا اور آپ کہتے ہیں کہ ناممکن ہے تو دکھا دوں گا کہ ناممکن باتیں بھی کبھی ممکن ہو جاتی ہیں۔ میں آج ہی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ پھر آپ لوگوں کو کوئی برائی نہ دے گا۔۔۔ (۶)

پورن کو اپنی امارت ناپسند تھی کیونکہ وہ اسے عشق کی راہ کا پتھر سمجھتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کاش وہ کسی کنگال گھرانے کا سپوت ہوتا تو کم از کم حصول محبت میں رکاوٹ تو پیش نہ آتی۔ گھر والوں نے پورن کے مصمم ارادوں کو بھانپ لیا اور تیزی سے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لیے آشا کو چپکے سے کملا (پورن کی شادی شدہ بہن) کے گھر دوسرے گاؤں بھجوا دیا گیا۔ پورن کو بتایا گیا کہ وہ مرضی سے گئی ہے کیونکہ وہ تمہاری زندگی کو اپنے ہاتھوں سے برباد نہیں کر سکتی تھی۔ پورن اس خبر سے افسردہ تو ہوا لیکن ہمت نہ ہاری اور گھر والوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ آشا کو ضرور ڈھونڈ نکالے گا۔ گھر والوں نے اس کی مستقل مزاجی سے خائف ہو کر مشہور کر دیا کہ گاؤں میں پھیلنے والی طاعون کی وبا نے آشا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گھر والوں کا یہ منصوبہ کامیاب رہا۔ اس خبر کے بعد پورن کا حوصلہ پست ہو گیا اور کچھ ہی عرصے بعد وہ گھر والوں کی مرضی کے مطابق شادی کرنے پر رضامند ہو گیا۔ پورن کی شادی اس کی بہن کملا کی نند شانتا سے طے ہو گئی۔ شادی دھوم دھام سے

ہوئی۔ پھیروں کے بعد اچانک منڈپ میں آگ بھڑک اٹھی۔ وہ اپنی دلہن کے ساتھ کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اس کی نظر اچانک ہی آشا پر پڑی۔ وہ شانتا کو چھوڑ کر دیوانوں کی طرح آشا کی جانب دوڑ پڑا۔ آشا کا ہاتھ پکڑ لیا اور دیوانہ وار پکار اٹھا:

آشا۔۔۔ اب تم نہیں جا سکتیں مجھے یوں چھوڑ کر۔ اس نے ایک پیاسے کی طرح اسے کلیجہ سے لگا کر کہا۔ بولو یہ کیا چال تھی سارے گھر کی!۔۔۔ میں سمجھا۔۔۔ اب میں سمجھا۔ لیکن بس ہو چکا کھیل چلو آشا ہم تم بھاگ چلیں اس مکار دنیا سے۔۔۔ چلو۔ (۷)

پورن آشا کو پکڑ کر درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ تھوڑی سی مسافت کے بعد بہن اور اس کے بچوں کا خیال آیا تو آشا کو وہیں رکنے کا کہا۔ وہ بہن اور اس کے بچوں کو صرف دیکھنے کی غرض سے چلا گیا۔ منشی شام لال نے موقع پاتے ہی آشا کو سمجھایا کہ کسی دوسری عورت کا گھر مت برباد کرو میں پیسے دیتا ہوں کسی دوسرے گاؤں چلی جاؤ۔ وہ جذباتی ہو کر چل پڑی۔ اتنے میں پورن بھی واپس آ گیا وہ آشا کو پکارتا رہا لیکن اس کی آہ و پکار نے آشا کے دل پر کچھ اثر نہ کیا۔ وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے پورن ٹھوکر کھا کر گر جاتا ہے اور سردی لگنے سے بیمار ہو جاتا ہے۔ شانتا اس کا بہت خیال رکھتی ہے، دوائیں وقت پر دیتی، کھانے پینے کا خیال رکھتی لیکن اس نے تو چپ سادھ لی تھی۔ وہ شانتا سے کوئی فالتو بات نہ کرتا۔ ماں کی دعوت پر شانتا اسے اپنے ساتھ میکے جانے کو کہتی ہے لیکن وہ سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ گھر میں مہیش نامی شادی شدہ آدمی کا شانتا سے میل جول کسی کو پسند نہیں تھا۔ جب بڑے بھائی، پورن کی توجہ اس معاملے کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ مبہوت ہوتا، بڑی بذلہ سنجی سے بیوی اور مہیش کے اس طرزِ عمل کی کھل کر تائید کرتا ہے:

سنو بھیا۔۔۔ وہ پریم کرتی ہے۔ یہی نا۔ کرنے دو اسے۔۔۔ تم نے کبھی پریم نہیں کیا۔۔۔ تم نے کبھی ایسے پریم نہیں کیا کہ۔۔۔ کہ۔۔۔ تم اس میں بھسم ہو گئے ہو۔ تم نے پریم کیا۔ کیسے؟ بھابھی سے تمہاری پریمتا تمہاری گود میں لا کر ڈال دی گئی۔ تب تم نے پریم کرنا سیکھا۔۔۔ اور۔۔ (۸)

شانتا پورن کی اس سرد مہری سے تنگ آ کر گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ شانتا کے اس عمل کو بھی وہ مثبت ہی لیتا ہے کہ وہ سمجھدار لڑکی تھی، اچھا ہی کیا۔ آشا اس کے دل و دماغ پر پوری طرح چھائی تھی۔ شانتا کے جانے کے بعد وہ اور زیادہ خاموش ہو گیا۔ اور انتقاماً بیمار رہنے لگا۔ پورن کو قریب المرگ دیکھ کر گھر والوں کا دل پسیج گیا اور انھوں نے بڑے بھیا کو آشا کو ساتھ لانے کے لیے بھیج دیا۔ وہ پورن کو موت کے بے رحم ہاتھوں سے بچانا چاہتے تھے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ آشا بڑے بھیا کے ساتھ آ جاتی ہے لیکن پورن کو بچا نہیں پاتی۔ ناول کا اختتام ایک المیے پر ہوتا ہے۔ پورن آشا کی آغوش میں دم توڑ دیتا ہے اور آشا بھی تیل چھڑک کر پورن کے ساتھ ہی آگ میں جل کر مر جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام و درنگ ہائیٹس کے ہیتھ کلف اور پورن کے کرداروں کی مماثلت کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

جنسی تدارک کے لیے اسے (پورن کو) بیوی مل چکی تھی۔ اسی طرح ہیتھ کلف کو بھی بیوی مل گئی تھی مگر اس کے دل و دماغ میں کیتھی بدستور بسی رہی۔ حالات کی تبدیلی اور طویل وقفہ بھی اس کے

انتقامی جذبہ کو سرد نہ کر سکے۔ پورن اس سلسلہ میں اتنا شدید نظر نہیں آتا مگر وہ بھی بیوی کی طرف مکمل سرد مہری برت کر اپنے انتقامی جذبہ کا اظہار کرتا ہے۔ (۹)

اس ناول میں پورن کا کردار ایسا ہے جو اپنے اندر انحراف کا پہلو رکھتا ہے۔ تاہم اس میں سرکشی سے زیادہ ہٹ دھرمی اور ضد نظر آتی ہے۔ اس کی ضد اسے خودسری پر اکساتی ہے لیکن ناول کا انجام المیہ ہونے اور پورن کے موت کو گلے لگالینے کے باوجود اس کردار میں وہ طاقت اور زور پیدا نہیں ہو سکا۔ جو روایت سے انحراف کرنے والے کرداروں کی خصوصیت ہوتا ہے۔ اس میں حقیقت کی بجائے ایک طرح کی رومانویت حاوی ہے۔ بقول طاہرہ صدیقہ:

> عصمت چغتائی نے اپنے ناول "ضدی" میں فرد کی آزادی کا سوال رومانوی انداز میں اٹھایا ہے۔ ان کا مؤقف ہے کہ بے ساختہ زندگی میں محبت ہی جملہ اقدارِ حیات میں سب سے بڑی قدر ہے۔ اس کی خاطر اگر روایتی اور سماجی اقدار کو بدلنا پڑے تو بدل دینا چاہیے ورنہ محبت کرنے والے سماجی تشدد کے ہتھوڑے سے کانچ کی طرح کرچی کرچی ہو جاتے ہیں اور پھر یہی کرچیاں سماج کے پاؤں لہولہان کر دیتی ہیں۔ سو فرد کی آزادی میں ہی سماج کی بقا مضمر ہے۔ فرد کی آزادی محبت سے عبارت ہے اور محبت سے تخلیق کے در وا ہوتے ہیں اور یہی تخلیقی رجحان سماج کو فرسودگی سے بچاتا ہے۔ (۱۰)

پورن آشا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کے لیے سرکشی پر اتر آتا ہے اور گھر چھوڑنے کی دھمکی دیتا ہے۔ یہاں اس کا کردار کسی قدر طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لیکن ایک چال کے نتیجے میں جب اس کے گھر والے آشا کو دور کر دیتے ہیں تو رفتہ رفتہ اس کے عشق کی آگ مدھم پڑ جاتی ہے اور وہ شکست خوردہ ہو کر گھر والوں کی بات مان کر شادی کر لیتا ہے۔ دوسری مرتبہ جب اسے آشا ملتی ہے تو اپنی بہن کے گھر کی فکر کرتے ہوئے پھر آشا کو گنوا دیتا ہے اور اپنے عشق اور جذبے کی بجائے مصلحت کو فوقیت دیتا ہے۔ آخر میں وہ مر جاتا ہے اور آشا بھی اس کے ساتھ جان دیتی ہے۔ لیکن پورن کی یہ موت بے بسی کی موت ہے۔ بغاوت کی نہیں یوں ہمیں حسرت کا سگنجوی کا پہلے بیان کیا گیا تجزیہ درست معلوم ہوتا ہے کہ عصمت کے باغی کردار بالآخر سمجھوتے کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کردار کے بارے میں علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

> عصمت چغتائی کے "ضدی" کا ہیرو پورن ایک جذباتی نوجوان ہے۔ وہ متوسط طبقے کے مصنوعی اخلاق کی وجہ سے ضدی بن جاتا ہے۔ اسے نام نہاد شرافت سے چڑ ہے۔ وہ ایک نچلے طبقے کی لڑکی سے عشق کرتا ہے لیکن خاندانی بندشوں کے خلاف یا رائے بغاوت نہ پاکر گھٹتا ہے، گھلتا ہے اور مر جاتا ہے۔ (۱۱)

پورن کو بھی عصمت کی طرح سماج یا روایات کی پاسداری کا خیال نہیں وہ بھی طبقاتی تقسیم سے نفرت کرتا ہے اور تمام انسانوں کو برابر سمجھتا ہے۔

شمن (ٹیڑھی لکیر)، عصمت چغتائی

''ٹیڑھی لکیر''عصمت کا سب سے کامیاب اور مشہور ہونے والا ناول ہے۔ اگرچہ اس پر اعتراضات بھی کیے گئے اور فحاشی اور عریانی کے الزام میں اس ناول کی وجہ سے ترقی پسند طبقہ عصمت چغتائی پر برہم بھی ہوا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک شاہکار ناول ہے۔ اس ناول کے حوالے سے پنڈت کشن پرشاد کول رقم طراز ہیں:

جس طرح پریم چند کا ''گؤدان'' ان کا شاہکار کہا جا سکتا ہے، اسی طرح ''ٹیڑھی لکیر'' عصمت چغتائی کا شاہکار ہے۔۔۔ ''ٹیڑھی لکیر'' میں ہمارے یہاں کی ماڈرن گرل کا مکمل نقشہ کھینچ کر عصمت نے اردو میں نئے ادب کی تخلیق کی ہے جس کے لیے ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔ (۱۲)

''ٹیڑھی لکیر'' کو نفسیاتی ناول کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس ناول کی ہیروئن شمن کی زندگی بہت سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہے۔ شمن گھر میں سب سے چھوٹی اور بہن بھائیوں میں اس کا نمبر دسواں ہے۔ شمن کی پیدائش کے موقع پر اس کی بڑی آپا بہت ہی پریشان تھیں کیونکہ ان پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ بڑی آپا کی سہیلی سلمٰی کی شادی کے دن ہی شمن کی پیدائش ہوئی۔ اسی لیے بڑی آپا شادی پر نہ جا سکیں۔ جب نوزائیدہ بہن کو نہلانے کے لیے بڑی آپا سے پانی گرم کرنے کو کہا گیا تو وہ کوسنے لگیں:

خدا غارت کرے اس منی سی بہن کو۔ اماں کی کوکھ کیوں نہیں بند ہو جاتی۔ حد ہو گئی تھی! بہن بھائی اور بہن بھائی۔ بس معلوم ہوتا تھا، بھک منگوں نے گھر دیکھ لیا ہے، اڈے چلے آتے ہیں۔ ویسے ہی کیا کم موجود تھے جو اور پے در پے آ رہے تھے۔ (۱۳)

شمن کو خاندانی روایت کے مطابق پرورش کے لیے ایک انّا کے حوالے کر دیا جاتا ہے لیکن کچھ عرصے بعد انّا بھی چلی جاتی ہے۔ شمن انّا کو بھی یاد کرتی ہے اور روتی ہے۔ انّا کے جانے کے بعد شمن کی بڑی بہن منجھو کسی حد تک اس کا خیال رکھتی ہے۔ لیکن اس کی بھی شادی ہو جاتی ہے۔ شمن جس سے پیار کرتی ہے، وہی اس سے چھن جاتا ہے۔ اس طرح وہ احساسِ محرومی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے حالات نے اسے منہ پھٹ اور بدتمیز بنا دیا۔ وہ اپنی باغی طبیعت کو نہ روک پائی۔ اس کے دل کی ہر وقت یہی تمنا تھی کہ وہ کسی کا قتل کر دے۔ قسمت نے کچھ ایسا کھیل کھیلا کہ جو بڑی آپا شمن کی پیدائش پر بہت دلبرداشتہ ہوئی تھیں۔ بیوہ ہونے کے بعد اپنے دو بچوں (بیٹا اور بیٹی) کے ہمراہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میکے آ گئیں۔ بڑی آپا کے دونوں بچے مہذب تھے۔ بڑی آپا کی بیٹی نوری تو شمن کے لیے معما بن گئی تھی۔ گھر کے سب لوگ ہی شمن سے نالاں تھے۔ کوئی بھی مہمان آتا تو بڑی آپا کے بچوں کو ضرور ملوایا جاتا تھا لیکن شمن کو مہمانوں سے دور ہی رکھا جاتا۔ اسی طرح عیدوں پر بھی نوری کے ہاتھوں پر خوب مہندی لگائی جاتی جبکہ شمن کے اس خیال کو حقیر اور فضول سمجھا جاتا تھا۔ شمن بڑی آپا سے اور بھی نفرت کرنے لگی۔ خوف کے مارے وہ بڑی آپا کے حکم کو ٹال تو نہ سکتی تھی لیکن اس کی اس فرمانبرداری میں بھی نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جو اس کے تاثرات سے عیاں تھی۔ گھر والوں کے رویے اور اس کی اپنی لاابالی طبیعت نے مل کر

اسے باغی بنادیا۔ آہستہ آہستہ ناروا سلوک کے ردِ عمل کے طور پر بات بات لڑنا جھگڑنا، بچوں کو مارنا اور بڑی آپا کے سوا کسی اور کی بات نہ ماننا اس کا معمول بن گیا تھا۔

گھر والے شمن کے رویے سے تنگ تھے اس لیے انھوں نے سوچا کہ اس کی حرکات کا نوری پر غلط اثر پڑ سکتا ہے اس لیے انھوں نے شمن اور نوری دونوں کو بورڈنگ ہاؤس بھیج دیا۔ دونوں ایک ہی کمرے میں رہتی تھیں وہاں بھی شمن نے نوری کو جی بھر کے مارا۔ نتیجتاً دونوں کے کمرے الگ کروا دیئے گئے۔ بورڈنگ ہاؤس میں شمن کی ملاقات مس چرن، رسول فاطمہ، پرنسپل کی بہن بلقیس، نجمہ اور پریما سے ہوتی ہے۔ سالانہ پکنک پر پرنسپل اپنے بھائی اور چند نوجوانوں کو اپنے ساتھ لے گئیں تاکہ اگر کوئی لڑکی ڈوب جائے تو وہ نکالنے میں مدد کریں۔

دورانِ پکنک ہی بلقیس نے اپنے بھائی رشید سے شمن کو ملوایا۔ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔ رشید شمن سے اظہارِ محبت بھی کر دیتا ہے۔ شمن بھی اسے چاہنے لگتی ہے۔ اسی عرصے میں خوشحال گھرانے سے تعلق رکھنے والی دو لڑکیاں بورڈنگ ہاؤس آجاتی ہیں۔ رشید ان کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ رشید جب کبھی بھی ملتا ہے اس سے چند میٹھی باتیں کر لیتا ہے لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی۔ دوسری طرف نوری بھی سکول میں اپنی جگہ بنا چکی تھی۔ شمن کو اب کوئی بھی نہ پوچھتا تھا۔ اس لیے وہ بکھر چکی تھی۔ مصنف نے شمن کی اس شکستہ حالت کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

> غرض ایک بار پھر اسے ناقابلِ بیان سنسان تنہائی کا احساس ہوا۔ اور اس شدت سے کہ اس نے ہر چیز سے بغاوت کر دی۔ (۱۴)

شمن ہر چیز سے نفرت کرنے لگی۔ ان حالات میں سہیلی پریما نے اسے سہارا دیا۔ دونوں نے مل کر ملاقاتی کارڈ ڈھونڈے اور خود ہی لکھ دیا کہ دونوں کے والدین خاندانی طور پر ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ شمن پریما کے گھر جا سکتی ہے یعنی ملاقات کارڈ میں اجازت نامہ خود ہی تیار کر لیا۔ اس طرح شمن ہر ہفتہ اتوار پریما کے گھر رہنے کے لیے چلی جاتی تھی۔ پریما بن ماں کے تھی لیکن ماں کی وفات کے بعد باپ نے اپنے بچوں کو بہت ہی اچھے طریقے سے پالا پوسا تھا۔ پریما کے والد رائے صاحب بہت ہی سلجھے ہوئے انسان تھے۔

شمن پریما کے والد رائے صاحب سے بہت متاثر تھی اسی لیے وہ ہندو دھرم کو بھی پسند کرنے لگی۔ وہ دل ہی دل میں رائے صاحب کو چاہنے لگی۔ وہ اپنی محبت کو زیادہ دیر تک اپنے سینے میں نہ چھپا سکی اور ایک دن اس نے رائے صاحب سے اظہارِ محبت کچھ یوں کیا:

> ''نہیں۔۔۔ نہیں رائے صاحب، میں مر جاؤں گی۔ رائے صاحب مجھے، رائے صاحب دور نہ کیجیے۔
>
> ''رائے صاحب۔۔۔۔ میں اپنا دھرم بھی بدل دوں گی۔'' (۱۵)

شمن تو رائے صاحب کے لیے اپنا مذہب بھی بدل دیتی لیکن شاید ایسا قسمت میں نہ لکھا تھا۔ رائے صاحب اچانک ہی دل کا دورہ پڑنے سے چل بسے۔

وقت گزرتا گیا اور شمن یونیورسٹی تک پہنچ گئی۔ وہیں اس کی ملاقات ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکنان افتخار، سیتل، اور ایلما سے ہوتی ہے۔ ایلما بھی ایک ایسی روایتی اقدار سے منحرف لڑکی ہے جس نے بن بیاہے ہی ایک بچے کو جنم دیا۔ وہ تو بچے کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن اپنی جان کو بچانے کے لیے اسے مجبوراً جنم دینا پڑا۔ شمن اور ایلما میں کافی اچھی دوستی تھی۔ شمن کے لیے جب خالہ زاد بھائی اعجاز کے رشتے کی بات ہوتی ہے۔ تو وہ صاف انکار کر دیتی ہے۔ وہ گھر والوں کو بتاتی ہے کہ وہ کسی جانور سے شادی کو ترجیح دے گی لیکن اعجاز سے شادی نہیں کرے گی۔ بقول مصنف کے:

> بغاوت! اس کی رگ رگ غرور سے پھڑک اٹھی۔ اسے خود اپنی طاقتوں پر حیرت ہونے لگی۔ اس نے سب کے منہ پر طمانچہ مار دیا، دل توڑ دیئے امیدیں خاک میں ملا دیں، اوہ! کتنی ظالم تھی وہ؟ (۱۶)

شمن سوچے سمجھے بغیر ترقی پسند تحریک کی پر جوش رکن بن جاتی ہے۔ بعد میں ایک قومی سکول کی پرنسپل کے عہدے پر فائز ہو جاتی ہے۔ ایلما اسے آئرش نوجوان رونی ٹیلر سے ملواتی ہے۔ ٹیلر شمن سے شادی کر لیتا ہے۔ شمن شادی کے بعد بھی اپنی خلاف روایت طبیعت کو نہ بدل سکی۔ بدزبانی کی وجہ سے دونوں میاں بیوی میں اکثر جھگڑا رہتا۔ رونی جب شمن کو اپنی ماں کے خط کے بارے میں بتاتا ہے اور ماں کی خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ وہ چاہتی ہیں کہ کوئی پوتا پوتی ہو۔ یہ سنتے ہی وہ سیخ پا ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ تو آدھا تیتر آدھا بٹیر والا حساب ہوا نا۔ یہ سن کر ٹیلر کہتا ہے کہ تمہارا کیا مطلب ہے کہ دونوں نے غلطی کی۔ وہ بے شرمی سے جواب دیتی ہے جی ہاں۔ اب یہی بہتر ہے کہ ہم دونوں اپنے راستے الگ کر لیں۔ ٹیلر شدید غصے میں آگیا۔ جب شمن نے ٹیلر کو ''ٹامی'' کہا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا کیونکہ وہ مذاق مذاق میں پہلے ہی بتا چکی تھی:

> ٹامی ہم ہندوستانی اس سفید ناجائز اولاد کو کہتے ہیں جو فوج میں بھرتی کر کے توپوں کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ ٹیلر اس کے منہ سے اتنی نیچ گالی سن کر کانپ اٹھا۔ تھوڑی دیر وہ ساکت و بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کی رنگت سفید پڑ گئی جیسے کسی نے پچکاری سے خون کھینچ لیا ہو۔ وہ چیخ چیخ کر گالیاں بکتا رہا۔ (۱۷)

شمن کی بے حسی نے ٹیلر کو بدظن کر دیا۔ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر محاذ پر چلا گیا۔ شمن ایک بار پھر تنہائی کا شکار ہو گئی۔ ایک دن جب اسے پتا چلتا ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔ اسے امریکہ میں بیٹھی ہوئی ساس کا خیال آتا ہے۔ اور رونی کے اکیلے پن پر بھی پریشان ہوتی ہے۔ یہیں ناول کا اختتام ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے شمن کے کردار کے بارے میں لکھا ہے:

> درحقیقت شمن کا اصلی مسئلہ یہ ہے کہ وہ یہ نہیں جانتی کہ اسے کس مقام پر رک جانا ہے۔ بس یہ ہی اس کا المیہ ہے۔ بہت سے متوسط طبقے کی گھٹن زدہ لڑکیاں اپنی اپنی قسمتوں پر شاکر رہ کر اپنی زندگیاں بسر کر جاتی ہیں مگر وہ ایک مخصوص باغی کردار ہے جب ہی تو وہ فکشن کا کردار ہے جہاں کہ قاری کو محسوس ہو کہ وہ ایک نئے کردار سے متعارف ہو رہا ہے۔ خواہ وہ حزنیہ کردار ہو یا طربیہ فکشن کا اہم کردار چونکاتا ضرور ہے۔ (۱۸)

وہ مزید لکھتے ہیں:

عصمت چغتائی بھی باغی رہی ہیں۔ انھوں نے اپنی راہ خود تراشی ہے۔ آخر میں انھوں نے دفن ہونے کی بجائے آگ کے سپرد کیے جانے کی وصیت کی تھی۔ انھوں نے ایک بیٹی کی بڑی جرأت مندی اور سماج کی تنقید کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہندو نوجوان سے شادی کی تھی۔ اتنی باتوں میں وہ شمن سے ملتی جلتی ہیں۔ (۱۹)

جیسا کہ ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے لکھا ہے کہ شمن کے کردار میں ناول کی مصنفہ عصمت چغتائی کے اپنے کردار کی جھلک موجود ہے۔ باغیانہ خیالات رکھنا، ترقی پسند تحریک سے تعلق اور ہر معاملے میں الجھنے کا پہلو واقعتاً شمن کے کردار میں عصمت چغتائی کے کردار کی جھلک کو نمایاں کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد عارف:

''ٹیڑھی لکیر'' میں عصمت چغتائی نے رٹی رٹائی فرسودہ زندگی کو مؤثر انداز میں رد کیا ہے۔ ان کا مؤقف ہے کہ ہر فرد کو اپنی زندگی منفرد انداز میں بسر کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ خاندان سمیت، سماج کو فرد کی ذاتی زندگی میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ یوں، نیا انسان زمانی و مکانی بندشوں سے آزاد پنپتا ہوا، انھیں نظر نہیں آتا۔ (۲۰)

شمن عصمت چغتائی کے یادرہ جانے والے کرداروں میں شامل ہے۔ اسے ہم صحیح معنوں میں روایات و اقدار سے منحرف کردار قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے ہاں سمجھوتے اور مصلحت کوشی کا رویہ نظر نہیں آتا۔ وہ ہر بات میں اور زندگی کے ہر مرحلے پر اپنی بات منوانا چاہتی ہے۔ اور اس کے لیے کئی طرح کا نقصان بھی اٹھاتی ہے۔ یوں یہ کردار اپنی بغاوت میں زیادہ مضبوط اور کردار نگاری کے فنی تقاضوں کو زیادہ خوبی کے ساتھ نبھاتا نظر آتا ہے۔

قدسیہ (دل کی دنیا)، عصمت چغتائی

عصمت چغتائی کے ناول ''دل کی دنیا'' میں قدسیہ خالہ ایک ایسا کردار ہے جس نے حالات سے سمجھوتہ کرنے یا پھر ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی روایتی طریقہ اختیار نہ کیا بلکہ بن طلاق لیے ہی دوسرا نکاح کر لیا۔ قدسیہ خالہ کے شوہر باقر حسین کو شادی کے فوراً بعد ہی ولایت بھیج دیا گیا۔ کچھ عرصہ تو وہ بیوی کو باقاعدگی سے خط لکھتے رہے لیکن بعد میں ایک میم سے شادی کر کے بیوی کی بے پناہ چاہت کو بھلا بیٹھے۔ قدسیہ نے شوہر کو لاتعداد خط لکھے لیکن اس نے کسی ایک کا جواب دینا بھی گوارا نہ کیا۔ جب قدسیہ خالہ کو شوہر کی دوسری شادی کی خبر ہوئی تو انھوں نے شوہر کو خط میں لکھا:

مجھے میم صاحبہ کی آیا سمجھ کر ہی ایک کونے میں ڈال لیجیے۔ آپ دونوں کی خدمت کروں گی۔ جھوٹن کھاؤں گی۔ اترن پہنوں گی اور منہ سے اف کر جاؤں تو جو چور کی سزا سو میری۔ آپ مالک ہیں میں آپ کی لونڈی میرے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوش نصیبی ہو گی کہ آپ کے قدموں میں دم نکلے۔ (۲۱)

قدسیہ خالہ کے شوہر شاید اپنی نئی نویلی دلہن میں اس قدر کھو چکے تھے کہ ان کے گوشۂ دل میں پہلی بیوی کا ذرا بھی درد موجود نہ تھا۔ انھوں نے خط کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ آخر کار قدسیہ خالہ بھی خط لکھ لکھ کر ہار گئیں۔ میاں کی بے رخی نے ان کی صحت کو بری طرح متاثر کیا۔ ان پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ البتہ قدسیہ خالہ کے لیے ایک بات قابلِ فخر تھی کہ سر تاج نے دھوبن یا چمارن سے بیاہ رچانے کی بجائے ایک میم سے شادی کی تھی۔ شبیر حسن قدسیہ خالہ کی تاریک زندگی میں روشنی کی ایک خوبصورت کرن کی طرح نمودار ہوئے۔ شبیر حسن جو کہ رشتے میں ان کے دیور تھے۔ اکثر ان کے گھر آنے لگے۔ کئی کئی گھنٹوں کی طویل نشستوں نے دونوں کو قریب کر دیا۔ وہ بہت اچھے نعت خواں تھے۔ شروع شروع میں تو وہ نعتیں سن سن کر تسکین حاصل کرتیں لیکن رفتہ رفتہ ان کی ذہنی ہم آہنگی بڑھتی گئی۔ ان کے عادات و اطوار میں نمایاں تبدیلی رونما ہونے لگی۔

قدسیہ خالہ کی ماں اپنی بیٹی کے بدلتے تیور دیکھ کر بھونچکا رہ گئیں۔ وہ بیٹی کو سمجھانے لگیں کہ وہ شبیر حسن سے زیادہ میل جول نہ رکھے، دنیا والے کیا کہیں گے۔ قدسیہ خالہ تو شاید فیصلہ کر چکی تھیں کہ وہ شبیر حسن کو اپنا جیون ساتھی بنائیں گی۔ وہ اپنے بناؤ سنگھار پر توجہ دینے لگیں۔ کپڑوں کے ساتھ میچنگ چوڑیاں پہننا ان کا معمول بن گیا تھا۔ خطرے کی گھنٹیاں بجتے ہی قدسیہ خالہ کی ماں نے شبیر حسن کا گھر میں داخلہ بند کر دیا۔ قدسیہ خالہ کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ برہم ہو گئیں اور کہنے لگیں کہ کتے کی موت مارنے سے بہتر ہے کہ مجھے زندہ دفن کرا دو۔ ماں کے کہنے پر شبیر حسن تو آنے جانے سے باز آ گئے لیکن قدسیہ خالہ کے دل میں عشق کی چنگاری بجھنے کی بجائے اور بھی بھڑک اٹھی۔ وہ بات بے بات ماں سے لڑتی جھگڑتی رہتی اور میاں کو بد دعائیں دیتی رہتیں۔ ایک دن ماں نے جل کر کہا کہ دوسرا خصم کرو گی؟ تو وہ بولیں:

"ہاں کروں گی۔۔۔
کروں گی۔۔۔"

ماں بولی جاؤ کوٹھے پر بیٹھ جاؤ تو انھوں نے جواب دیا:

"کوٹھے پر بھی بیٹھ جاؤں گی۔ دیکھتی ہوں کوئی میرا کیا کر لیتا ہے۔" (۲۲)

قدسیہ خالہ کا شبیر حسن کے بغیر دل نہ لگتا تھا، اسی لیے وہ ہر وقت پریشان رہتیں اور ماں سے الجھتی رہتیں۔ یہ بات کسی نہ کسی طرح ان کے سسرال پہنچ گئی۔ سسر جو کہ قدسیہ خالہ کے ماموں بھی تھے، اس نتیجے پر پہنچے کہ قدسیہ سے ماں کا بے جا لاڈ سب کے لیے رسوائی کا سبب بن سکتا ہے، اس لیے قدسیہ کو اپنے گھر بلا لینا چاہیے۔ بلاوے کی خبر پہنچتے ہی قدسیہ خالہ زخمی شیرنی کی طرح بپھر گئیں۔ انھوں نے سسرال جانے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ ماموں کو بھی لعن طعن کرنے لگیں کہ کبھی بیٹے کو تو کچھ کہا نہیں اور مجھ پر حق جتاتے ہیں۔ ماں بیٹی کی جلی کٹی باتیں سن کر سیخ پا ہو گئیں اور بیٹی پر جوتی اٹھالی۔ بیٹی نے جواباً، ماں کی کلائیاں مروڑ دیں اور سِل کا بٹّا اٹھالیا کہ اگر کسی نے بھی اسے چھونے کی کوشش بھی کی تو وہ سر پھاڑ دے گی۔ چند ساعتوں کے بعد بٹّا پھینک کر وہ پسا بے پسا شیشہ کھانے ہی والی تھیں کہ شبیر حسن نے قدسیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ قدسیہ کی اس حالتِ زار کو مصنف نے کچھ یوں بیان کیا:

دس برس بعد کسی مرد نے انھیں ہاتھ لگایا! ان کے ہاتھ بے بس ہو کر نیچے گر گئے۔ مڑ کر انھوں نے شبیر حسن کی آنکھوں میں دیکھا اس وقت تو وہ بہشت بریں سے بھی لوٹ آتیں۔ آنکھیں موند کر وہ تیورا کر ان کے سینے پر گریں۔ (۲۳)

شبیر حسن نے سب کے سامنے خالہ کو زور سے بھینچا اور پلنگ پر لٹا دیا وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔ گھر والے سمجھے کہ کسی بھوت پریت کا سایہ ہے سب گھر والے خالہ کی خدمت گزاری میں جٹ گئے۔ شوہر طلاق دینے سے انکاری ہو گیا۔ شبیر حسن کے دوست نے طلاق لینے کے لیے ایک مشورہ دیا کہ اگر قدسیہ عیسائی ہو جائیں تو طلاق ہو سکتی ہے۔ دونوں اس پر تیار تھے لیکن جب پادری صاحب کو مذہب کی تبدیلی کی وجہ بتائی گئی تو وہ برافروختہ ہوئے اور کہا کہ اگر انھوں نے دوبارہ اسلام اختیار کیا تو طلاق باطل ہو جائے گی۔ چچا مستقیم) مچھو چچا) نے جو کہ قدسیہ خالہ کے خاموش عاشق تھے، مدد کی اور اسی شام قاضی کو بلا کر نکاح کر دیا گیا۔ شبیر حسن کے دوست ابرار نے جو وکیل تھے، بتایا کہ نکاح نہیں ہوا، اگر اس کی خبر قدسیہ کے شوہر کو ہو گئی تو دونوں حرام کاری کے جرم کی سزا پائیں گے۔ اس نکاحِ فاسد کے بعد دونوں ہی چھپ کر زندگی گزارنے لگے جس کا ذکر مصنفہ نے یوں کیا:

قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں ساری عمر چوروں کی طرح چھپتے رہے۔ معمولی سے عام انسان ویسے ہی گمنام رہتے ہیں پھر بھی خوف تو رہتا تھا حالانکہ چچا میاں نے انھیں یقین دلا رکھا تھا کہ اگر اس نے کچھ گڑبڑ کی تو اس کا قصہ ہی پاک کر دیں گے۔ اور خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ قدسیہ خالہ کہا کرتی تھیں۔ (۲۴)

شادی کے بعد دونوں کے ہاں بیٹی ہوتی ہے جس کا نام رفیعہ حسن رکھا جاتا ہے۔ جب طلاق کا بل پاس ہوا اس وقت تک باقر حسین نے قدسیہ خالہ کو طلاق نہ دی تھی۔ بیٹی بھی بڑی ہو چکی تھی اور وہ سب برٹش نیشنلٹی لے کر برطانیہ جا رہے تھے۔ شاید اسی وجہ سے انھوں نے طلاق کے مسئلے کو نہ چھیڑا یعنی خلع کا کیس دائر نہ کیا اور چپ چاپ انگلستان چلے گئے۔ ماں کی محبت کا ذکر بیٹی رفیعہ حسن کچھ یوں کرتی ہے:

امی ابو کی محبت دیکھ کر شادی بیاہ اور طلاق کی اہمیت پر ہنسی آنے لگتی ہے۔ (۲۵)

بیٹی اپنے ماں باپ کے اس عمل کو سراہتی ہے اور کہتی ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی کیا وہ بالکل ٹھیک کیا۔ وہ مستقیم چچا کی خاموش محبت سے بھی متاثر دکھائی دیتی ہے کیونکہ وہ کہتی ہے کہ کاش مجھے بھی کوئی ایسا ہی سچا پریمی ملے جو اپنا سب کچھ میری خوشی کے لیے قربان کر دے۔ قدسیہ خالہ نے اپنی بیٹی کو خوب پڑھایا لکھایا۔ وہ برطانیہ سے پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ اس طرح ناول اختتام کو پہنچتا ہے۔ نیلم، فرزانہ، قدسیہ خالہ اور معصومہ کے کرداروں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

دل کی دنیا میں قدسیہ بیگم اپنے فطری تقاضوں کے سامنے سپر ڈالتی ہیں اور معاشرے سے بغاوت کرتی ہے، اس کا کردار معاشرے کے غلط اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف ایک احتجاج بھی ہے اور عورت کی آزادی اور اس کے حقوق کا علمبردار بھی۔ وہ زندگی کی ایک مثبت قدر کی نشاندہی کرتی ہے

لیکن معصومہ میں یہ خصوصیت مفقود ہے۔ معاشرے نے معصومہ کو جس راہ پر ڈالا اس کے نفس نے بھی اس کو قبول کر لیا بلکہ اس ماحول کا حصہ بننے میں اس کے نفس کا بھی ہاتھ تھا۔ (۲۶)

اس ناول میں عصمت چغتائی نے ایک ایسی صورت حال پیش کی ہے جو قرینِ قیاس تو ہے مگر عام نہیں۔ قدسیہ خالہ کا کردار ہمارے معاشرے میں عام طور سے موجود نہیں، یہ عصمت کی اختراع ہے۔ کیونکہ اتنی بڑی بغاوت کرنا جو معاشرتی، اخلاقی، قانونی اور شرعی تقاضوں سے بیک وقت متصادم ہو، نہایت جرأت کا تقاضا کرتا ہے۔ مخفی طور پر ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی مثالیں تو معاشرے میں موجود ہیں لیکن علی الاعلان اتنے زیادہ باغیانہ رویے کی مثال شاید ہی مل سکے۔ تاہم ناول میں اس کردار کی گنجائش اس حوالے سے بجا طور پر پر نکل آتی ہے کہ ناول نگار کرداروں کے جذبات و احساسات، واقعات کے عقب میں موجود حقائق کا ادراک کر کے انھیں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے کی کتنی ہی عورتیں معاشرتی، اخلاقی، قانونی یا مذہبی اقدار کی پاسداری میں زندگی کی خوشیوں اور اپنے جائز حقوق کو قربان کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہیں۔ لیکن عصمت نے اس کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے قدسیہ خالہ کا کردار تخلیق کیا ہے۔ جس کا رویہ کم مانوس ہونے کے باوجود حقیقی دکھائی دیتا ہے۔ اس کردار کے حوالے سے ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد رقم طراز ہیں:

> اشتراکی نقطہ نظر سے عصمت کے ناول دل کی دنیا کو اس لیے کامیاب کہا جا سکتا ہے کہ اس میں عورت نے نئی زندگی اور نئی قدروں کا خیر مقدم کیا ہے۔ سماجی ناانصافی کے خلاف بغاوت کی ہے۔ فرسودہ خاندانی روایات کو بے جگری کے ساتھ توڑا ہے۔ اشتراکیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان کو اپنی صلاحیتوں سے، اپنی جدوجہد اور محنت سے اپنی دنیا آپ پیدا کرنی چاہیے اور عصمت نے ان سبھی چیزوں کو قدسیہ بیگم کے کردار میں سمو کر قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ (۲۷)

چھمن میاں (باندی)، عصمت چغتائی

عصمت چغتائی کے ناول ''باندی'' کے ہیرو چھمن میاں نے اسے خاندان میں آنکھ کھولی جس کا دستور تھا کہ گھر میں حسین باندیاں اس غرض سے رکھی جاتیں کہ وہ جوان لڑکوں کی آسائش کا سامان بنیں۔ تاکہ لڑکے گھر سے باہر کسی بری لت کا شکار نہ ہوں۔ خاندانی رواج کے مطابق باندیوں سے ناجائز رشتہ استوار کرنا تو گوارا تھا لیکن نکاح کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ چھمن میاں کی خدمتگاری کے لیے جس باندی کو متعین کیا گیا، اس کا نام حلیمہ تھا۔ وہ سید زادی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد ماں نے پیٹ کی خاطر اناج کے عوض اسے (حلیمہ) چھمن میاں کی ماں کے حوالے کر دیا۔ ان کی قربت محبت میں بدلنے لگی یعنی چھمن میاں حلیمہ کو چاہنے لگے۔ چاہت کا نتیجہ حمل کی صورت میں سامنے آیا۔ چھمن میاں یہ خبر سن کر باغ باغ ہو گئے۔ چھمن کی ماں کو جب اس حرکت کا پتا چلا تو اس نے اسے گاؤں بھجوانے کا سوچ لیا۔ حلیمہ کے گاؤں جانے کی خبر سے چھمن میاں غمناک ہو گئے۔ اور ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ گاؤں نہیں جائے گی۔ جب انھوں نے ماں کے فیصلے کو اٹل پایا تو دوسرے حربے استعمال کرنے لگے یعنی اپنے چچازاد بھائی کے پاس گئے اور منت سماجت کی کہ اسے (حلیمہ کو) گاؤں

نہ بھیجا جائے۔ بڑے بھائی پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انھوں نے یہ کہہ کر کہ یہ محل کا پرانا دستور ہے، اپنی جان چھڑانا چاہی۔ چھمن میاں پہلے تو ناامید ہو گئے لیکن پھر بلا جھجک کہہ دیا:

"وہ گائے بھینس نہیں، میرے بچے کی امانت دار ہے۔" (۲۸)

بڑے بھائی ان کی ہٹ دھرمی پر بھڑک اٹھے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ باندی سے جسم کا رشتہ ہوتا ہے دل کا نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے چھمن میاں سے دیوانگی کی کیفیت کو ختم کرنے کا کہا اور خوش کرنے کے لیے کہا کہ کوئی اور انتظام کر دیا جائے گا۔ چھمن میاں کو مزید کسی اور انتظام کی ضرورت نہ تھی۔ گھر والوں نے ایک دوسری لڑکی حرمہ سے نکاح کروانے کی ترکیب سوچی لیکن چھمن میاں نے صاف انکار کر دیا اور اپنے چچازاد بھائی افضال سے بحث و تکرار کی۔ جس کا مصنف نے یوں ذکر کیا ہے:

"میں حرمہ سے شادی نہیں کروں گا۔"
"پھر۔"
"حلیمہ میری بیوی ہے۔"
"نکاح ہو گیا؟"
"میں اس سے ہی نکاح کروں گا۔" (۲۹)

چھمن میاں نے علی الاعلان کہہ دیا کہ اگر حلیمہ کو گاؤں بھیج دیا گیا تو وہ بھی پڑھائی کو خیر باد کہہ دیں گے۔ ماں بھی اپنے فیصلے پر ڈٹی رہیں اور صاف کہہ دیا کہ چاہے ان کی میت بھی اٹھ جائے لیکن حلیمہ اس گھر میں نہ رہے گی۔ نایاب بوبو جو اس گھر کی پرانی باندی تھی کافی موقع شناس اور گھاگ تھی۔ اس نے بیگم صاحبہ کو سمجھایا کہ چھمن میاں ابھی نوجوان اور جذباتی ہیں انھیں منانا اتنا آسان نہ ہو گا۔ اس لیے حلیمہ کو ادھر ہی رکھا جائے۔ خود ہی چار دنوں میں جی اکتا جائے گا۔ نایاب نے حلیمہ کا مزید فائدہ یہ بتایا کہ نجم بیٹی کے ولایت جانے کے بعد ان کے نوزائیدہ کو دودھ حلیمہ ہی پلا دے گی۔ نایاب کی باتوں سے بیگم صاحبہ متاثر ہوئیں اور اپنے ارادے کو مؤخر کر دیا۔ نایاب بوبو کی یہ قیاس آرائی کہ چھمن میاں کا دل بھر جائے گا درست ثابت نہ ہوئی۔ بقول مصنف:

> مگر چھمن میاں قانون قدرت اور نایاب دونوں کو جھٹلا رہے تھے کیونکہ وہ دیوانے تھے کہ پیر کی جوتی کو کلیجہ سے لگا رکھا تھا۔ ایسی بے حیائی تو کسی نوابزادے نے کسی بیگم کے معاملے میں نہیں لادی۔ سر جھکائے مارا مارا زچہ بچہ کے رکھ رکھاؤ پر کتابیں پڑھی جا رہی ہیں۔ سارا جیب خرچ باندی کے لیے وٹامن کی گولیاں اور ٹانک لانے پر خرچ ہو رہا ہے۔ (۳۰)

ایک دن نایاب نے حلیمہ سے بچے کے باپ کے متعلق پوچھا تو مارے شرم کے وہ کچھ نہ بولی۔ وہ اصرار کرتی رہی کہ نام بتاؤ لیکن حلیمہ چھمن میاں کا نام نہیں لینا چاہتی تھی۔ نایاب نے اس بات پر حلیمہ کو اتنا مارا کہ وہ درد کے مارے دوہری

ہو گئی۔ اس دن چھمن میاں گھر پر نہیں تھے۔ میچ کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ جب وہ کپ جیت کر واپس آئے تو حلیمہ کو سامنے نہ پاکر اس کی تلاش میں لگ گئے۔ گھر میں سے کوئی حلیمہ کے بارے میں نہیں بتا رہا تھا۔ آخر کار جب انھیں حلیمہ کی تکلیف کا پتا چلتا ہے تو نایاب کو ڈاکٹرنی بلانے کا کہتے ہیں وہ انھیں بری طرح ڈانٹ دیتی ہے اور انھیں اپنے دوست کے پاس جانے کو کہتی ہے جب وہ ماں کے پاس آتے ہیں تو وہ فی البدیہہ دوروں کا ناٹک کر لیتی ہے۔ وہ بڑے بھیا کے پاس مدد کی آس لے کر جاتے ہیں اور حلیمہ کی بری حالت کے بارے میں بتاتے ہیں تو وہ بھی بڑی بے رخی سے جواب دیتے ہیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ خدا تو نہیں ہوں جو اس کی جان بچالوں۔ وہ چھمن میاں کو لڑکی چھوڑنے کا کہتے ہیں اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ آوارہ ہے۔ حرام کا بچہ پیدا کر رہی ہے۔ انھوں نے بڑے بھیا کی باتوں پر تاسف بھرے انداز میں کہا کہ وہ آوارہ لڑکی نہیں ہے۔ بڑے بھیا سیخ پا ہو گئے اور غصے سے بولے:

> اماں اتنا ہکلاتے کیوں ہو، نکاح نہیں ہوا تو عورت فاحشہ ہے۔ زانیہ ہے، سنگسار کرنے کے قابل ہے۔ مر جائے تو اچھا ہے۔ خس کم جہاں پاک۔ (۳۱)

چھمن میاں اضطرابی کیفیت میں کبھی ایک کے پاس مدد کے لیے جاتے تو کبھی دوسرے کے پاس۔ لیکن ہر طرف انکار ہی تھا۔ انھوں نے چچا سے رجوع کیا لیکن وہ بھی کسی سے کم نہ تھے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ دینے کا وعدہ کیا اور بڑی بے رحمی سے کہا کہ چھوڑ دو اس باندی کو چھمن میاں پر تو باپ بننے کا جنون اس قدر حاوی ہو چکا تھا کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ آخر کار پھپھو کے گھر گئے اور مدد کی اپیل کی۔ انھوں نے ایمبولینس کو بلوالیا۔ ایمبولینس کے گھر پہنچتے ہی کہرام مچ گیا۔ نواب صاحب نے گولی مارنے کی نیت سے رائفل اٹھالی لیکن ایمبولینس کے عقب میں کھڑی پولیس کی گاڑی کو دیکھتے ہی ان کے ارادے ماند پڑ گئے۔ چھمن میاں نے خون میں لت پت حلیمہ کو خود اٹھایا اور ایمبولینس میں ڈالا۔ ابا کے کہنے پر گھر اور جائیداد سے دستبردار ہو گئے اور دستبرداری کے کاغذات پر دستخط کر دیے۔ چھمن میاں کے مستقبل کی تصویر مصنفہ نے کچھ یوں کھینچی:

> چھمن اب ایک سڑی سی گلی میں ایک سڑیل سے مکان میں رہتے ہیں۔ کسی ایک اسکول میں گیند بلا سکھاتے ہیں، کالج بھی جاتے ہیں۔۔۔ یہ بچہ ان کی باندی سے ہے۔ پتہ نہیں باندی سے نکاح بھی کیا ہے کہ نہیں۔ (۳۲)

عصمت چغتائی کے اس ناول کو ناقدین نے توجہ کے قابل نہیں سمجھا ہے۔ اس لیے زیادہ تر لکھنے والوں نے عصمت کے باقی ناولوں کے حوالے سے لکھا ہے۔ تاہم اس ناول کا ہیرو چھمن ایسا کردار ہے جس میں نہ صرف انحراف کی روش موجود ہے بلکہ وہ اپنے خیالات سے دستبردار ہونے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس وہ نہ صرف معاشرتی رسوم و رواج کو خاطر میں نہیں لاتا بلکہ اپنے خاندان کی روایات کو روندنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ اس کی بغاوت کا نقطۂ عروج اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ اپنے ہونے والے بچے کی ماں کی خاطر پورے خاندان کی مرضی کے خلاف جانے کے ساتھ ساتھ جائیداد سے برطرفی بھی گوارا کر لیتا ہے اور اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے۔

عصمت چغتائی کے ناولوں میں روایات و اقدار سے منحرف کردار اصل میں ان کی شخصیت کے عکاس ہیں۔ عصمت چغتائی خود معاشرتی روایات سے منحرف ہیں۔ ان کے ناولوں کی پیش کش کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ناولوں کے نسوانی کردار بہت سے حوالوں سے مصنفہ کی اپنی شخصیت کی جھلک پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کرداروں میں عصمت چغتائی کا مؤقف اور بعض سماجی مسائل کے حوالے سے نقطۂ نظر بڑی صراحت کے ساتھ نمایاں ہوتا نظر آتا ہے۔ یہ کردار اپنے مزاج اور اپنے ماحول کے حوالے سے جارحانہ رویے رکھتے ہیں اور ضد، ہٹ دھرمی، سرکشی، بغاوت ان کے خمیر میں گندھی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کا نتیجہ یوں بھی نکلا ہے کہ بعض کرداروں میں سرکشی کے رویے اتنے زیادہ ابھر آئے ہیں کہ مصنوعی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس کے باوجود عصمت چغتائی کے باغی کردار اردو ناول میں ایک منفرد جہت کا اضافہ کرتے ہیں۔

عصمت چغتائی بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کے افکار میں بھی بغاوت اور انحراف کے زاویے نمایاں ہیں۔ ان کے ناولوں کے کردار منحرف اور سرکش ہیں اور انھوں نے پوری دلیل اور جواز کے ساتھ ان کے انحراف اور سرکشی کی وجوہات بیان کی ہیں۔ ان کے ناولوں کا ایک خاص ماحول ہے جس میں ان کے کردار اپنے اپنے مخصوص نفسیاتی پس منظر کے ساتھ اجاگر ہوتے ہیں۔ عصمت چغتائی کی کردار نگاری میں نفسیاتی پہلو کی طرف توجہ بہت زیادہ ہے اس لیے ان کے کردار فطری معلوم ہوتے ہیں۔ عورتوں کے حوالے سے انھوں نے جن معاشرتی مسائل پر مبنی کردار پیش کیے ہیں وہ اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ قراۃ العین حیدر۔ ''لیڈی چنگیز خان''، مشمولہ ''عصمت چغتائی شخصیت اور فن''، مرتبہ، ایم۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر۔ اسلام آباد، ورڈ ویژن پبلشرز، ص:۶۹

۲۔ الطاف فاطمہ۔ ''سنسنی کی متلاشی'' مشمولہ ''عصمت چغتائی شخصیت اور فن''، مرتبہ، ایم۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر۔ اسلام آباد، ورڈ ویژن پبلشرز، ص:۳۲۱

۳۔ ایم۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر: ''عصمت چغتائی۔۔۔۔ شخصیت اور فن''مشمولہ ''عصمت چغتائی شخصیت اور فن''، مرتبہ، ایم۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر۔ اسلام آباد، ورڈ ویژن پبلشرز، ص:۱۰

۴۔ حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر: ''ادب۔ علمی اور فکری زاویے'' کراچی: نفیس اکیڈمی، جنوری ۱۹۹۴، ص:۴۵۶

۵۔ ہارون ایوب، ڈاکٹر: '' اردو ناول پریم چند کے بعد''، لکھنؤ، ۱۹۵۷ء، ص:۱۷

۶۔ عصمت چغتائی، کلیات عصمت چغتائی (ناول)، ترتیب و تحقیق: آصف نواز، لاہور،: مکتبہ شعر و ادب، س ن، ص:۱۰۴

۷۔ ایضاً، ص۱۱۵

۸۔ ایضاً، ص۱۲۸

۹۔ عبد السلام، ڈاکٹر: اردو ناول بیسویں صدی میں، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ،، ۱۹۷۲ء، ص:۳۵۴

۱۰۔ طاہرہ صدیقہ، دوسری جنگ عظیم کے اردو ادب پر اثرات، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص:۲۴۸

۱۱۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، ص:۴۸۲

۱۲۔ کشن پرشاد کول، پنڈت، نیا ادب، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، س ن، ص:۲۵۴

۱۳۔ عصمت چغتائی، کلیات عصمت چغتائی (ناول)، ص:۱۳۹

۱۴۔ ایضاً، ص:۲۴۶

۱۵۔ ایضاً، ص:۳۰۲

۱۶۔ ایضاً، ص:۳۱۸

۱۷۔ ایضاً، ص:۵۵۲

۱۸۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر: عصمت کی شمن پر تازہ نظر، مشمولہ تخلیقی ادب، شمارہ:۳،، اسلام آباد: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۰۳ء، ص:۲۲۲

۱۹۔ ایضاً، ص:۲۲۲

۲۰۔ محمد عارف، ڈاکٹر: اردو ناول میں آزادی کے تصورات، ص:۱۵

۲۱۔ عصمت چغتائی، کلیات عصمت چغتائی (ناول)، ص:۹۷۷

۲۲۔ ایضاً، ص:۱۰۲۳

۲۳۔ ایضاً، ص:۱۰۲۵

۲۴۔ ایضاً، ص:۱۰۳۷

۲۵۔ ایضاً، ص:۱۰۳۷

۲۶۔ ایضاً، ص:۱۰۷

۲۷۔ زرینہ عقیل احمد، ڈاکٹر: اردو ناول میں سوشلزم، الہ آباد، کتابستان، ۱۹۸۲ء، ص:۴۹۶

۲۸۔ عصمت چغتائی، کلیات عصمت چغتائی (ناول)، ص:۱۴۶۱

۲۹۔ ایضاً، ص:۱۴۶۲

۳۰۔ ایضاً، ص:۱۴۶۴

۳۱۔ ایضاً، ص:۱۴۷۵

۳۲۔ ایضاً، ص۱۴۷۷